⊙ ڈاکٹر محمد امجد عابد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

⊙⊙ ڈاکٹر عبدالعزیز ملک

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد

استعماری بیانیوں کی تفہیم اور جدید اُردو تنقید

Abstract:

Colonialists are the forces that try to occupy all the resources of the world, and after domination, these forces try to implement their ideologies and lifestyle on the colonized nations. The Sub-continent also remained in the clutches of colonial and imperialists forces and they injured both the individual and the society. The critics of that contemporary era could not remain aloof from such an atmosphere, and they made colonialism an open secret by condemning it. This article will focus on the services of those critics who not only played their unforgettable role in exposing the evils of colonialism but also directed the society to counter this evil by virtue of creating a new ideology.

Keywords:

Colonialism, Imperialism, Ideology, Resources, Sub-Continent, Society

اُردو تنقید نے جب عقلیّت سے اثر قبول کرتے ہوئے نیچر سے مطابقت اور ہم آہنگی کو حوالہ بنایا تو اس کے پیشِ نظر فطرت کا حسن اور اس کا جمال آفریں منظر نامہ تھا۔ مولانا حالیؔ جنہیں ہم اردو تنقید کا معمارِ اوّل کہتے ہیں نے اِسی بنیادی اصول کے تحت پیش رفت کی۔ تاہم انھوں نے اپنی اس جمال آفرینی کو زیادہ اثر انگیز بنانے کے لیے سماج کی بھی بات کی۔ لیکن اسے بھی عقلیّت پسندی کے تابع ایک ازلی حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ رومانیت پسندوں نے تو سماج سے مکمل طور پر کنارہ کشی اختیار کر کے فرد کی ذات اور اس کے جذبات کو اہمیت دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگ عظیم نہ صرف ساری دنیا

کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی بلکہ ہندوستان بھی اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ غیر ملکی طاقتوں کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں استعمار کا سکہ چلتا تھا۔ یہ وہ استعمار تھا جو اپنے علاقے سے دور رقبوں اور ملکوں پر قابض تھا۔ ان کا مطمع نظر یہ تھا کہ ان کے قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھایا جائے اور انسانوں کو اپنی ترقی کے لیے ایندھن کے طور پر استعمال کیا جائے اور مفتوح قوموں کا استحصال کیا جائے۔ استعماری قوتوں کے غلبے کے بعد ہمارے لوگوں کے ذہن ہی نہیں بلکہ ان کی استعدادیں اور قوتیں بھی غیر ملکی قبضے میں تھیں۔ چنانچہ یہ جنگ جہاں کہیں بھی لڑی جا رہی تھی اس کی لام بندی ہندوستان کے گلی کوچوں اور دیہاتوں میں ہوئی جہاں سے جبراً نوجوانوں کو بھرتی کر کے بدیسی آقاؤں کے سپرد کیا گیا۔ یہ ہندوستانی معاشرے پر استعماریت کا نہایت گہرا وار تھا جس نے یہاں کے معاشی، سماجی، تہذیبی اور اخلاقی نظام کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ بقول ڈاکٹر امجد طفیل:

> ''دیسی اقوام کو فتح کرنے کے بعد یورپی اقوام نے ان پر اپنے معیارات، اپنے طرز بود و باش اور اپنے تصورات نافذ کرنا شروع کیے۔ یوں مسئلہ صرف سادہ انداز میں وسائل پر قبضے تک محدود نہ رہا ۔ دنیا کو ایک خاص انداز میں ڈھالنے اور ایک خاص تہذیب کو قبول کرنے کے لیے جائز و ناجائز ذرائع استعمال کیے جانے لگے۔ اس سے وہ شکل اُبھری جسے استعمار کا نام دیا جاتا ہے۔''(۱)

استعماری قوتیں ایک طرف ساری دنیا کے وسائل ہتھیانے کی کوشش میں تھیں تو دوسری طرف وہ یہ تاثر دے رہے تھے کہ جیسے وہ جن علاقوں کو فتح کر رہے ہیں وہ غیر آباد تھے یا وہاں پر موجود مخلوقات کا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا۔ استعمار کی یہ بے رحم مشین اپنے راستے میں آنے والی ہر چیز کو پیستی جا رہی تھی۔ برصغیر میں استعماری قوتوں کو حتمی اور کلی حیثیت، جو کہ ۱۸۵۷ء کے بعد حاصل ہوئی، کے بعد استعمار نے تعلیم کے میدان میں تفریق پیدا کرنے کے بعد زبانوں میں تفریق پیدا کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ برصغیر میں اپنے قیام کو طول دیا جا سکے۔ ڈاکٹر امجد طفیل نے استعمار کے اس رویے کی بڑی خوبصورتی سے تصویر کشی کی ہے۔

> ''انیسویں صدی میں انگریز استعمار ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبے کو اپنی گرفت میں لینے اور اپنی مرضی کے مطابق بدلنے کے لیے تیار تھا۔ استعمار ہندوستان کی زبانوں، علوم و فنون، ثقافتوں، مذہبوں اور طرز زندگی کی ہر علامت کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا تھا............مگر باباطن وہ یہاں اپنے تجارتی، مذہبی اور استعماراتی مقاصد کو آگے بڑھا رہا تھا۔''(۲)

اس پر افسوس ناک صورت حال یہ تھی کہ ہمارا ادیب جذبوں کی انگیخت پر حُسن کے نت نئے زاویے تراشنے میں مصروف تھا۔ اسے حُسن سے بھی لگاؤ تھا اور زندگی بھی عزیز تھی۔ جو خواب بھی دیکھتا تھا اور خُوش گوار دنوں کی آس میں ان خوابوں کی لاحاصلی کے مفہوم سے بھی آگاہ تھا۔

یوں تو ہر عہد کا تخلیق کار اپنے عہد کی نبضوں پر انگلیاں رکھتا ہے اور دھڑکنوں کے زیر و بم کو صاف سنتا ہے۔ لیکن بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ اسے اپنی ذات اس قدر عزیز لگنے لگتی ہے کہ اسے ماسوائے ذات کچھ اور دکھائی نہیں دیتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فن کو محض فن سے معاملہ تھا اور اس سوچ کو فن کے محض سطحی پہلوؤں تک رسائی تھی۔ فن کو کیا ہونا چاہیے، اس

کے مقاصد کیا ہیں اور اسے کس طرح انسان کو فلاح و بہبود کے کام میں لایا جا سکتا ہے، ایک تخلیق کار کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ دنیا بھر کی استعماری قوتیں ہمیشہ ایسے ہی موقعوں کی منتظر رہتی ہیں۔ ایسے ہی موقعوں پر ان کے استعماری اور استبدادی رویّے اپنے نوکیلے پنجے نکالتے ہیں اور فرد کے ساتھ ساتھ پورے سماج کے چہرے کو زخمی کر دیتے ہیں۔ چنانچہ عالمی سطح پر لڑی جانے والی جنگوں کا زمانہ کم و بیش یہی ہے جب ہمارا ادب انفعالیت کا شکار تھا۔ اسی موقع پر ہمارے چند بالغ نظر اور صاحبِ دانش نقادوں نے فکری سطح پر اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت کی صورت حال میں ایک واضح تبدیلی تیس کی دہائی میں پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔

جب ۱۹۳۰ء کے اقتصادی بحران کی رُو سے عالمی سطح پر بائیں بازو کی سیاست، جسے ہم اشتراکیت کا نام بھی دے سکتے ہیں، کا رجحان پیدا ہوا جس کے واضح اثرات اس دور کی ادبی تخلیقات اور تنقیدی ادب پر نظر آتے ہیں۔ یورپ میں استعماریت کے خلاف ایک ردِّ عمل کی بنیادی وجہ دراصل اقتصادی بدحالی تھی اور اس کے نتیجے میں سوشلزم کی طرف لوگوں کا ذہن جھک رہا تھا۔ ہندوستان میں صورت حال بہت مختلف تھی اور یہاں اس باعث بھی عوام کا جوش اور جذبہ دیدنی تھا کہ یہاں آزادی کی جدوجہد عروج پر تھی۔ استعماریت کے استبدادی اور ظالمانہ ہتھکنڈوں کے خلاف لوگ کھلم کُھلا باہر نکل آئے تھے اور واضح طور پر استعماری بیانیوں پر چار حرف بھیج رہے تھے۔ اسی زمانے میں اردو تنقید نے اپنی جہت کا تعین کیا اور زندگی کو نئے سرے سے سمجھنے اور ادب اور زندگی کے تعلق کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ زندگی کا تعلق چونکہ سماج سے ہے اس لیے ہمیں سماج کے بننے، بگڑنے اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو جاننے کی ضرورت ہے۔

غور کیا جائے تو سماج اشتراکِ عمل کے لیے یکجا ہونے والے افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ ایسے افراد جن کی سَمت اور جہت ایک اور مقصد یکساں ہو۔ ہر فرد کی مادی ضروریات کم و بیش ایک جیسی ہوتی ہیں اور یہ استعمار کا پرانا حربہ ہے کہ وہ سماج کو شکست و ریخت سے دوچار کرنے کے لیے فرد کی مادی ضروریات میں تفاوت پیدا کر کے طبقوں کو پنپنے کا موقع دیتا ہے۔ چنانچہ اس موقعے پر یہ تصور عام ہوا کہ سماج کا سنگِ بنیاد انسان کی مالی ضروریات اور پیداوار کی تقسیم پر ہے اور افراد کا باہمی تعلق اس پیچ و خم کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ سماج کی ترقی سے مراد یہ ہے کہ افراد کے باہمی رشتے کو استحکام حاصل ہو اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی آسان ہوتی جائے۔ چنانچہ یہی وہ تصور ہے جس پر ترقی پسند تنقید نے اپنی عمارت تعمیر کی اور سماج کو مادی ترقی ہی کا راستہ نہیں دکھایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اسے ذہنی اور تمدنی ترقی کے اعتبار سے بھی مرتبۂ بلند تک لے جانے کی سعی کی۔ اس تصور کے ساتھ ادب کے لیے لازم قرار پایا کہ وہ انسانیت کے نقاد کے منصب پر فائز ہو، اس کی کج روّیوں اور خام کاریوں کو بے نقاب کرے، اس کی زندگی کو ثباتِ دوام بخشے اور اسے یہ باور کرائے کہ وہ حالات کا غلام نہیں بلکہ حالات اس کے غلام ہیں۔ اور یوں وہ ادب کو اس کے تغیر پسند قدامت شکن اور عہد جدید کے پیش رو کے مقام سے آشنا کرے۔ یہی ادب کا مقصد ہے کہ زمان و مکان کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر اپنے گرد و پیش سے آگاہی حاصل کر کے ترقی کے راستوں پر قدم مارے۔ ترقی پسند نقادوں نے یہ طے کیا کہ ادب کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان جذبات کی ترجمانی کرے جو دنیا کو ترقی کی راہ دکھائیں۔ زندگی کا مقصد بھی یہی ہے کہ انسان کی ارتقا پذیری کے عمل کو تیز تر کیا جائے۔

یہ تمام نظریات ذہنی طور پر پستی اور پسماندگی کا شکار سماج اور اس کے افراد کے لیے نئے بھی تھے اور حیران کُن بھی۔اس کی وجہ یہ ہے کہ عام آدمی ہی نہیں ادیب کے ذہن پر بھی استعماریت کا آسیب طاری تھا۔وہ استعماریت جس نے سماج کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے ادیب کو نت نئے بہانے سکھا دیے تھے اور اسے عقلیت پسندی اور رومانیت طرازی کے گنجلکوں میں اس طرح الجھا دیا تھا کہ اسے آگے بڑھنے کے تمام راستے مسدود نظر آتے تھے۔اس میں بہت کچھ گنجائش ان رجعت پسند قوتوں کے لیے نکلتی تھی جنھوں نے انسان اور انسانیت کے مابین خلیج کو وسیع سے وسیع تر کر دیا تھا۔اس موقع پر روس کے مشہور مفکّر پرنس کروپاٹکن کے یہ الفاظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں:

> ''اگر تمھارے دل میں بنی نوع انسان کا درد ہے،تمھارے جذبات کا رباب ان کے دکھ سکھ کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اور اگر ایک حساس انسان کی طرح تم زندگی کے پیغام کو سن سکتے ہو تو تم ہر قسم کے ظلم کے مخالف ہو جاؤ گے۔جب تم کروڑوں آدمیوں کی فاقہ کشی پر غور کرو گے۔جب تم میدان جنگ میں لاکھوں بے گناہوں کے لاشے تڑپتے دیکھو گے،جب تمھارے بھائی بند قید و بند اور دار و رسن کے مصائب جھیلتے نظر آئیں گے اور جب تمھاری آنکھوں کے آگے دلیری کے مقابلے میں بزدلی اور نیکی کے مقابلے میں بدی فتح یاب ہوگی تو ادیبو اور شاعرو! اگر تم انسان ہو تو ضرور آگے آؤ گے،تم ہرگز خاموش نہیں رہ سکتے۔تم مظلوموں کی طرفداری کرو گے۔کیوں کہ حق و صداقت کی حمایت ہر انسان کا فرض ہے۔''(۳)

یہ الفاظ ایک اعلیٰ ادب کا معیار اور اس کا لائحہ عمل قرار دیے جا سکتے ہیں اور یہ الفاظ استعماری بیانیے پر ایسی کاری ضرب لگاتے ہیں کہ استعماریت کے پھیلائے ہوئے جال اور اس کے سارے طلسمات آناً فاناً خاک ہو جاتے ہیں۔

ترقی پسند نقادوں نے صورت حال کی جس طرح عکاسی کی اور استعماری بیانیے کے فریب کا پردہ چاک کیا اس سے انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر گہرا شعور بیدار ہوا۔انسانوں کے درمیان تفریق اور تفاوت کا تصور باطل ثابت ہوا۔عام انسانوں اور کم تر لوگوں کی بھی بات کی جانے لگی۔چھوٹے بڑے طبقوں کو ختم کرنے میں مدد ملی۔یہ تصور عام ہوا کہ زندگی پر ہر شخص کا برابر کا حق ہے اور سب کو زندگی کے ثمرات مساویانہ طور پر حاصل ہونے چاہئیں۔ادبی سطح پر اس بات کو اعتبار حاصل ہوا کہ انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کو اہمیت حاصل ہے۔خیال اور وجدان کے ماورائی تصورات سے زیادہ ارضیت اہم ہے اور زمینی حقائق کو تسلیم کیے بغیر نہ فرد قائم رہ سکتا ہے نہ سماج۔

اس سلسلے میں جن ترقی پسند نقادوں نے اپنا حصہ ڈالا اور اردو تنقید کی اس نئی فکری جہت کو تنقیدی سطح پر متعارف کروانے کے ساتھ ساتھ اسے عملی تنقید کا حصہ بنایا۔ان میں سید سجاد ظہیر،اختر حسین رائے پوری،سید احتشام حسین،ممتاز حسین اور فیض احمد فیض کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ان بلند اور قد آور شخصیات نے نہ صرف استعماری بیانیے کی تفہیم میں اپنا کردار ادا کیا بلکہ اس کے مقابلے میں سماج کو ایک صحیح سمت عطا کرنے اور نئے شعور کی نظریہ سازی میں ناقابل فراموش کردار ادا کیا۔یہ انھی لوگوں کی کوششوں کا حاصل تھا کہ فرد کے ذہن میں ایک زندگی بخش شعور نے جنم لیا۔وہ زندگی جو اس کی جان کا روگ بن چکی تھی اسے نہ صرف خوبصورت نظر آنے لگی بلکہ زندگی کے نئے امکانات کی طرف اس کے قدم تیزی

سے بڑھنے لگے۔

عصرِ حاضر کے نقاد کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہونا چاہیے کہ انیسویں صدی کی ابتدا کا ماحول تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ اکیسویں صدی کے ابتدا میں بھی نظر آ رہا ہے جس میں امریکی استعمار ثقافتی عالمگیریت کے پردے میں دنیا کو ایک مخصوص رنگ میں ڈھالنے کے درپے ہے۔مگر اس کی یہ مذموم کوشش ناکام بنانے کے لیے عصر حاضر کے نقاد کو اپنا فرض منصبی ادا کرنا ہے۔اُسے اس بات کا بخوبی جائزہ لینا ہے کہ گلوبل ویلیج کی صورت میں استعمار کی جو نئی شکلیں ہمارے سامنے آ رہی ہیں اس حوالے سے ہمارا ردِعمل کیا ہونا چاہیے؟ کیا اُسے من و عن قبول کرنا چاہیے؟ کیا اس کا مقابلہ اور دفاع کرنا چاہیے اور یکسر مسترد کر دینا چاہیے؟ یا مفاہمت کی صورت اختیار کرتے ہوئے کم از کم دے کر زیادہ سے زیادہ بچا لیا جائے۔عصر حاضر کے نقاد کو ان سوالوں پر غور و فکر کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

حوالہ جات

۱۔ امجد طفیل، ادب کا عالمی دریچہ، (لاہور: شرکت پریس، ۲۰۱۲ء)، ص ۱۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۔۲۵

۳۔ بہ حوالہ: حمیرا اشفاق، ترقی پسند تنقید......پون صدی کا قصہ، فکری و نظری مباحث، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۲۷